ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی
پروفیسر و سابق صدر، شعبۂ اردو،
جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ (بھارت)

Dr. Arshad Masood Hashmi
Professor & Ex-Chairperson,
Department of Urdu,
Jai Prakash University, Chapra (India)

چراغ حسن حسرت اور نصیر حسین خیال

Chiragh Hasan Hasrat And Naseer Hussain Khayal

Abstract: This article explores the literary relationship between Chiragh Hasan Hasrat and Naseer Husain Khayal with a focus on the ways in which Hasrat's editorial vision and Khayal's creative prose intersected to enrich Urdu literature. By situating Khayal's prose writings within the cultural and intellectual milieu of *Aaftab*, the journal edited by Hasrat, the study highlights how the periodical became a formative platform for Khayal's emergence as a distinctive prose stylist. The article further examines Hasrat's role not only as a critic and mentor but also as an enabler who recognized Khayal's potential and offered him visibility in the Urdu literary public sphere. In turn, Khayal's contributions reinforced the relevance of *Aaftab* as a space for experimentation and innovation in Urdu prose. Through this exploration, the article establishes Khayal's importance in the broader trajectory of Urdu prose writing and underscores the editorial interventions of Hasrat as a significant factor in shaping literary production in early twentieth-century India.

Keywords: Chiragh Hasan Hasrat, Naseer Husain Khayal, *Aaftab* (Urdu journal), Editorial patronage, Periodical culture in Urdu

نصیر حسین خیال کا تعلق انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے عظیم آباد اور کلکتے کی اس علمی و ادبی فضا سے تھا جو دہلی کی طرز پر اردو تہذیب، زبان اور معاشرت کا مرکز سمجھی جاتی تھی۔ عظیم آباد کے اس خاندان نے تقریباً دو سو برسوں تک اردو پروری کی تھی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کو فروغ دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خاندان کی زبان، اس کے علمی ذوق نے اس شہر کو دہلی کے طرز پر اردو کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

خیال کے مورثِ اعلیٰ عرب سے ایران آئے تھے۔ انھوں نے مغلوں کے عہد میں ہندوستان کا رخ کیا۔ اس خاندان کے افراد فرخ سیر اور محمد شاہ کے دورِ سلطنت میں دہلی اور پانی پت سے بہار کے صدر مقام عظیم آباد تشریف لائے تھے۔ مغلیہ عہد میں ان کی حیثیت اس قدر بلند تھی کہ دو بھائی، قطب الملک نواب سید عبداللہ خان (جنھیں نواب سید میاں ثانی عبداللہ خان ثانی بھی کہا جاتا ہے) اور امیر الامرا نواب سید حسین علی خان، تاریخ میں ''بادشاہ گر'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان دونوں کا شمار اٹھارویں صدی کے اوائل میں مغل سلطنت کے باا‌ثر امرا میں ہوتا تھا۔ اسی خانوادے کے ایک اہم

فرد عمدۃ الملک فیروز جنگ سپاہ سردار میر بخشی سید حسین علی خان بارہہ (۱۶۶۶ء–۱۷۲۰ء) تھے، جو بہار کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ان کا مستقر عظیم آباد ہی تھا، جہاں دہلی کے تخت شاہی کی جانب سے ان کے لیے جاگیر مقرر کی گئی تھی۔ ان کے بھائی نواب زین الدین علی خان عرف میر زینا کو بھی بہار میں جاگیر عطا ہوئی اور اسی نسبت سے ان کی اولاد نے یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ خیال کے والد سید نوروز حسین اور والدہ سید النسا بیگم دونوں نواب بیگم صاحبہ کی اولادوں میں سے تھے۔ نواب بیگم صاحبہ، سید تفضل علی کی زوجہ تھیں اور براہ راست نواب میر سید زین الدین علی خان کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ خیال کے نانا سید محمد عباس اور دادا سید محمد محسن اسی خانوادے کے افراد تھے۔ اس خاندان کا سلسلۂ نسب محمد نور تک پہنچتا ہے، جن کی زوجہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کی دختر تھیں۔(۱) خیال کے پردادا میر سید تفضل علی المعروف بہ میرن صاحب، جو الہ آباد میں تحصیلدار کے منصب پر فائز تھے، کے دو صاحبزادے تھے: سید علی نقی خاں محسن، جو عرف عام میں میر محسن کہلاتے تھے، اور سید عباس حسین، جو عباس مرزا یا میر عباس کے نام سے مشہور ہوئے۔ موخر الذکر، شاد عظیم آبادی کے والد تھے۔ اس نسبت سے شاد، خیال کے ماموں بھی تھے اور خاندانی رشتے سے چچا بھی قرار پاتے تھے۔(۲)

خیال کی والدہ، سید النسا بیگم، شاد عظیم آبادی کی ہمشیر تھیں، اور سید نوروز حسین کی زوجہ۔ خیال کے دادا نواب سید محمد محسن خان اور نانا سید محمد عباس بھی دہلی سے وابستہ تھے۔ اس خانوادے کے ایک بزرگ، نواب سید دانشمند خان کے فرزند میر رستم علی دہلی سے عظیم آباد آئے اور مغل سرکار کی عطا کردہ جاگیروں کی بدولت یہیں کے ہو رہے۔ ان کے بعد ان کی اولادوں میں سید مردان علی، سید حیدر علی، سید قنبر علی، سید تفضل علی، سید محمد محسن اور سید محمد عباس شامل تھے، جنھوں نے عظیم آباد کو علمی و تہذیبی مرکز بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ خاندان ساداتِ بارہہ کے سلسلے سے تھا، جو حسنی و حسینی نسب کا حامل تھا۔ میر محسن کی اولاد میں تین فرزند و دختر شامل تھے: جعفر حسین، بسم اللہ بیگم اور نوروز حسین۔ دوسری جانب میر عباس کی بھی تین اولادیں تھیں: علی محمد شاد، امیر حسن ایجاد اور سید النسا بیگم، جو عرف عام میں جھبو صاحب کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ جب سید النسا بیگم کا نکاح اسی خاندان کے فرد، نوروز حسین، سے ہوا تو خاندانوں کے تعلقات مزید گہرے ہو گئے۔ اس رشتے سے دو اولادیں ہوئیں: سید نصیر حسین اور سجادی بیگم۔ سجادی بیگم ایک باوقار اور خوش ذوق خاتون تھیں، لیکن کم عمری ہی میں سل و دق کی بیماری کا شکار ہوئیں اور جانبر نہ ہو سکیں۔ ان کا نکاح نواب سید محمد یاس سے ہوا تھا جو خود تلمیذ شاد کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ وہ نواب سید محمد تقی خاں کے صاحبزادے تھے۔ نواب تقی خاں بہار کے شہر مظفرپور میں سائنٹفک سوسائٹی کی شاخ کے صدر ہوا کرتے تھے۔

نصیر حسین کی پیدائش شہر عظیم آباد پٹنہ کے محلہ حاجی گنج کی چھوٹی حویلی میں ۲۱ مارچ ۱۸۷۵ء کو ہوئی تھی۔ سید رضا قاسم کے مطابق ان کی تاریخ ولادت ۲۱ مارچ ۱۸۶۰ء ہے۔(۳) شائق احمد عثمانی نے بھی یہی تاریخ پیدائش لکھی ہے۔(۴) سید بدرالدین احمد(۵) اور محمد اقبال سلیم(۶) نے سال پیدائش ۱۸۷۸ء لکھا ہے۔ خود خیال نے بھی اپنا سال ولادت ۱۸۷۸ء ہی درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ”میں پٹنہ عظیم آباد کے ایک قدیم، مشہور اور خوشحال خاندان میں ۲۱ ارچ ۱۸۷۸ء کو بروز نوروز پیدا ہوا۔“(۷) خیال کا لکھا سنہ پیدائش قطعی غلط ہے۔ نبیرۂ شاد، نقی احمد ارشاد، نے لکھا ہے کہ خیال ۲۱ مارچ ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔(۸) عیسوی اور ہجری تقویم کی مناسبت سے انھوں نے جو توضیحات پیش کی ہیں وہ محل نظر ہیں۔ خیال کا بیان ہے کہ ان کی پیدائش کے تین برسوں کے بعد والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ”مغل اور اردو“ کے مطابق خیال سات برس سے زیادہ کے نہ تھے کہ ان کی دادی کا انتقال ہو

گیا۔ نقی احمد ارشاد نے لکھا ہے کہ خیال کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ خیال کے باپ نے انھیں چار برس کا چھوڑا۔ والد سید نوروز حسین کا انتقال ۱۲۹۶ھ میں ہوا۔ ان کی وفات پہ شاد عظیم آبادی کے لکھے قطعۂ تاریخ رحلت میں سال وفات ۱۲۹۶ھ درج ہے۔ ماہ کا ذکر نہیں ملتا۔ خیال کی دادی کی رحلت ۴ ربیع الثانی ۱۳۰۰ھ کو ہوئی۔ اس پس منظر میں نقی احمد ارشاد کا یہ بیان درست ہے کہ خیال کی ولادت ۱۲۹۳ھ میں ہوئی ہو گی۔ لیکن عیسوی تقویم کے اعتبار سے اسے ان کا ۱۸۷۱ء یا ۱۸۷۲ء کہنا، یا سید نوروز حسین کے سال وصال ۱۲۹۶ھ کو ۱۸۷۶ء لکھنا مناسب نہیں ہے۔ تاریخوں کے ہجری سے عیسوی تقویم میں منتقلی کے طریقۂ کار سے محض ایک دن کے فرق کے ساتھ یہ تاریخیں یوں متعین ہوتی ہیں: خیال کے والد کے انتقال کا سال ۱۸۷۹ء، خیال کی دادی کی رحلت ۱۲ فروری ۱۸۸۳ء۔ اس لحاظ سے خیال کا سال پیدائش ۱۸۶۰ء ۱۸۸۰ء، ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۸ء نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ اگر سید نوروز حسین کے ۱۲۹۶ھ میں انتقال سے تین سال قبل اور دادی کی رحلت سے سات سال قبل کے اعتبار سے دیکھیں تو ۱۲۹۲ھ میں خیال کی پیدائش ہوئی ہو گی۔ خیال کی تاریخ پیدائش کے معاملے میں ۲۱ مارچ کا ذکر ہر جگہ ہے۔ اس اعتبار سے ۲۱ مارچ ۱۸۷۵ء کو ۱۲۹۲ھ کے ماہ صفر کی ۱۴ویں یا ۱۳ویں تھی، اور یہی خیال کی تاریخ پیدائش ٹھیرتی ہے۔ خیال کے والد سید نوروز حسین شاد عظیم آبادی کے حقیقی چچازاد بھائی تھے اور ان کی زوجہ یعنی خیال کی والدہ شاد کی چھوٹی بہن تھیں۔ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں سید نوروز حسین کی رحلت کے بعد خیال کی والدہ سید النسا بیگم کا عقد ثانی سید جعفر حسین سے ہوا جن سے انھیں تین اولادیں ہوئیں: سیدہ بیگم، عابد حسین کمال اور صادق حسین نہال۔ گویا سید النسا بیگم کی کل پانچ اولادیں تھیں۔ سید جعفر حسین ۹۵ برس کی عمر میں فالج کے شکار ہو کر ۱۹۰۹ء میں قضا کر گئے۔ خیال کی والدہ کا انتقال ۱۵ اگست ۱۹۴۳ء کو ہوا۔ ان کے انتقال سے قبل چار اولادیں (سجادی بیگم، سیدہ بیگم، عابد حسین کمال اور خیال) اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ پانچویں، صادق حسین نہال، کی رحلت ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔

خیال خود نوشت ''تزکِ خیال ''میں لکھتے ہیں کہ ''سنہ ۱۸۷۹ء میں، جب میری عمر انیس برس تھی، کلکتہ (مٹیابرج) کے ایک متمول اور معزز خانوادے میں میری شادی ہوئی''۔(۹) اس کے برعکس بدرالدین احمد اور اقبال سلیم نے ان کی شادی کا سال ۱۸۹۹ء درج کیا ہے، جبکہ نقی احمد ارشاد کے مطابق یہ واقعہ ۱۸۹۶ء کا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق خیال نے ۱۸۹۶ء میں نواب واجد علی شاہ کے وزیرِ انتظام الدولہ مرزا احمد بیگ کی دختر، کنیز اُم سلمٰی، سے نکاح کیا۔ مرزا احمد بیگ کا تعلق کشمیری ترک النسل خاندان سے تھا اور کلکتہ کے انٹالی، بنیاپوکھر اور مٹیابرج جیسے علاقوں میں ان کی متعدد کوٹھیاں واقع تھیں۔ شادی کے بعد خیال نے کلکتے میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی۔

خیال ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو پٹنہ واپس آئے تھے۔ شائق احمد عثمانی کے نام اسی تاریخ کے ایک خط میں انھوں نے ذکر کیا تھا کہ وہ پٹنے سے الہ آباد، علی گڑھ اور پھر دلی کا سفر کریں گے۔ دلی جانے کے بعد وہ سخت علیل ہو گئے تھے اور اسی حالت میں علی گڑھ لائے گئے تھے۔ وہاں سے اسی برس انھوں نے پھر علی گڑھ کا رخ کیا اور ۹ دسمبر کو چھتاری کے نواب سر احمد سعید خاں، وزیر اعظم، صوبۂ متحدہ کے مہمان ہوئے۔ وہیں حرکت قلب بند ہو جانے سے ۱۱ دسمبر کو انتقال ہو گیا۔ ایک صاحبزادے تھے، امیر نواب، جن کا انتقال کراچی میں ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ تقسیم ہند کے چند برسوں کے بعد امیر نواب پاکستان ہجرت کر گئے۔ ان کے سلسلے میں خیال کے خاندان والوں کو بھی کسی قسم کی واقفیت نہ تھی۔(۱۰) نقی احمد ارشاد نے ہجرت کے بعد ان کے حالات کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی جن اصحاب نے خیال کو موضوع بنایا ہے ان کے یہاں امیر نواب سے ناواقفیت کا ہی علم ہوتا ہے۔

بہزاد فاطمی نے صرف یہ ذکر کیا ہے کہ امیر نواب کراچی میں قیام کے دوران انگریزی مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے انگریزی میں حقوق العباد پہ امیر نواب کی ایک مطبوعہ تصنیف کا تذکرہ کیا ہے۔(۱۱)

نصیر حسین خیال کی تین مطبوعہ کتابیں ہیں: "مغل اور اردو"، (۱۲) "داستان اردو" (۱۳) اور "داستان عجم" (۱۴)۔ ان کے علاوہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں سوانحی تحریر "تزک خیال" بھی شامل ہے جس کا بڑا حصہ عظیم آباد اور کلکتے کی بعض ایسی شخصیتوں کے ذکر پر مبنی ہے جن سے خیال کے مراسم تھے۔ خیال کی خطابت کی چند مثالیں اور مکتوبات بھی ہمارے پیش نظر ہیں۔ یہ خیال کا کل اثاثہ ہے۔ بہار و بنگال ہی نہیں، بر صغیر میں اردو نثر بطور خاص علمی نثر اور انشا پردازی کے فروغ میں خیال کی خدمات کے تعین کے دوران میں ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہماری تاریخ و تنقید نے اب تک یہی کیا ہے۔ قدوس صہبائی کا یہ بیان (۱۵) صداقت پر مبنی ہے کہ نواب نصیر حسین خیال مولانا شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ کے کم عمر ہم عصر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولوی عبدالحق، عبدالقادر، منشی دیانرائن نگم، مولانا اسمٰعیل میر ٹھی اور منشی سجاد حسین کے ہم مرتبہ اور ہم عصر تھے لیکن اردو میں زبان و ادب کی مسلمہ تاریخ میں مشکل ہی سے ان کا ذکر ملتا ہے۔ اور اگر کسی نے ذکر کیا بھی تو، بجز ایک دو اصحاب کے، وہ بھی مولوی محمد حسین آزاد کے پس منظر میں۔ جن نقادوں اور محققوں نے نواب نصیر حسین خیال پر کچھ لکھا ہے ان میں سے اب تک میری نظر سے چار یا پانچ مضمون گزرے ہیں اور ان میں بھی نواب موصوف کے اصل مقام اور طرزِ نگارش و اسلوب کے متعلق مفصل بحث نہیں کی گئی ہے لیکن یہ حقیقت تسلیم کی گئی ہے کہ زبانوں کی تاریخ میں جب تک اردو زبان کا نام باقی رہے گا، نصیر حسین خیال کا نام بھی ایک بے مثل ادیب کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ نواب ایک منفرد اور مخصوص طرزِ تحریر کے مالک تھے۔ اپنی تحریر کے موضوع اور اس کے مخاطبین کے مطابق الفاظ استعمال کرنے پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ الفاظ کی شوخی اور بانکپن کے باوجود عبارت میں بے انتہا سادگی اور روانی قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ ٹھوس اور خالص علمی موضوعات اور لطیف طنز اور ظرافت پر یکساں عبور رکھتے تھے۔

"داستان اردو والے نواب صاحب" سے مشہور نصیر حسین خان خیال نے اوائل عمری سے ہی روشن خیالی، قوم دوستی اور اصلاحی فکر کو اپنا شعار بنایا۔ انھوں نے صوبۂ بہار کی بولی کو اردو میں رائج کر کے اسے ٹکسالی درجہ دینے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اردو دانوں کی اخلاقیات سنوارنے پر بھی زور دیا۔ ان کے نزدیک اردو کو "ملکی زبان" بنانے کے لیے اس میں مقامی رنگ اور قومی بو باس کی شمولیت ضروری تھی۔ انھوں نے غزل گوئی اور محفلِ مشاعرہ کی بے حاصل روش کو ختم کرنے اور نثر نگاری کو فروغ دینے کی مہم چلائی تا کہ یہ ادبی رویہ معاشرتی و علمی تقاضوں کے مطابق ہو اور روایات سے بھی جڑا رہے۔ اسی مقصد کے تحت وہ اردو کو فارسی کے بوجھ سے آزاد کر کے ایک موثر اور متحرک قوت بنانا چاہتے تھے، تا کہ یہ زبان صرف تفننِ طبع نہیں بلکہ غور و فکر اور سماجی فلاح کا وسیلہ بن سکے۔ اپنی تحریروں میں وہ بار بار مسلمانوں کو ان خرافات سے دور رہنے کی نصیحت کرتے رہے جو ان کے اخلاق و کردار کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔ وہ خاص طور پر شیعہ برادری میں رائج اُن عادات و رسوم کے مخالف تھے جنھیں وہ زمانے کی نئی اختراعات یا بدعتیں سمجھتے تھے۔ اپنے بزرگ شاد عظیم آبادی کی طرح وہ شیعہ سنی اختلافات ختم کرنے کی بھی سعی کرتے رہے۔ اس پر توجہ دیے بغیر کہ ان کا سامع کون ہے یا ان کی باتوں پر کیا ردعمل ہو گا، ان تمام معاملات میں وہ راست گو اور سخت گیر تھے۔ مخالفت کو وہ خوشی سے قبول کرتے اور اسے مسلمانوں کی غفلت

سے بیداری کی نشانی قرار دیتے۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں انھوں نے اس سخت لہجے کا دفاع بھی کیا اور لکھا کہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی قوم کو جگانے کا واحد طریقہ اسے جھنجھوڑنا ہے۔ اگر اس سے تلملاہٹ پیدا ہو تو اسے بیداری کی علامت سمجھنا چاہیے۔

نصیر حسین خان خیال نے ملک گیر سطح پر مسلم۔ہندو اتحاد کے قیام اور باہمی اعتماد کی فضا قائم کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا کو بنیاد بنا کر ایسے نظریات پیش کیے جن سے اردو کا ازلی تعلق سرزمینِ ہند سے ثابت کیا جا سکے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیمی بیداری اور سماجی ترقی کے لیے غیر مسلموں سے مضبوط رشتے قائم کرنا ناگزیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال میں مسلم لیگ کے قیام میں کلیدی کردار ادا کرنے کے باوجود وہ اس کی سرگرمیوں سے الگ ہو گئے، کیونکہ لیگ ہندو مسلم دوریوں کو بڑھا رہی تھی۔ اس دور میں جب دونوں قوموں کے درمیان کشیدگی بڑھ رہی تھی، مسلمان علاحدہ شناخت کے خواہاں تھے اور ہندو حلقوں میں بھی نفرتیں پھیل رہی تھیں، خیال نے قومی یکجہتی کا پیغام دیا۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اعلان کیا کہ اردو کی اخلاقی شاعری یعنی مرثیہ کو ہندوستانی قدیم رزمیوں سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کے نزدیک اردو کوئی آریائی نہیں بلکہ خالص دیسی زبان ہے، جو قدیم باشندگانِ ہند کی تخلیق ہے۔ اسی لیے وہ اسے "غیر آریائی" زبان قرار دیتے تھے۔ خیال کے نزدیک مراثیِ انیس اور ہندوستانی رزمیے اس سرزمین کی ایسی تخلیقات ہیں جن سے اخلاق اور کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ دوسری تمام شاعری ان کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ انیس اور مرثیہ نگاری ان کے محبوب موضوعات تھے اور انھوں نے ان ہی کے ذریعے اردو والوں کی اخلاقی تشکیل کی کاوشیں کیں۔ یہی فکر ان کے خطبات، مضامین اور مکاتیب میں بھی نظر آتی ہے۔ مزید بر آں، ان کی مختلف تحریروں اور ہم عصروں کی شہادتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ زبان و قوم کی فلاح کو اپنی قلمکاری کا اصل نصب العین سمجھتے تھے۔ خیال ہمیشہ ادب کو اصلاحی اور مقصدی بنانے پر مُصِر رہے۔ ان کی تقریباً تمام تحریریں گواہی دیتی ہیں کہ وہ ہر دور میں پیشِ نظر مقاصد کے مطابق موضوع اور زبان کا انتخاب کرتے تھے۔ جب مذہبی اصلاحات پر توجہ دیتے تو ان کی زبان عالمانہ رنگ اختیار کر لیتی، اور جب عوام سے خطاب کرتے تو ان کے لہجے میں سادگی اور عوامی آہنگ نمایاں ہوتا۔ علمی و ادبی مسائل پر اظہار خیال کے موقع پر زبان میں فکری سنجیدگی کے ساتھ ادبی لطافت بھی جھلکتی۔ حتیٰ کہ ظریفانہ تحریروں میں بھی ان کے الفاظ کے انتخاب اور اسلوب کی جدت ایک نیا ذوق پیدا کرتی۔ انشا پردازی کا ان کا کمال یہ تھا کہ مشکل سے مشکل مذہبی، سماجی اور ادبی موضوعات کو اس انداز میں پیش کرتے کہ تحریر دلچسپ بھی رہتی اور اپنے مقصد کی تکمیل بھی کرتی۔

خیال نے مذہبی اور ثقافتی نوعیت کے مضامین کے علاوہ تاریخی، تنقیدی، ظریفانہ اور خالص ادبی مضامین بھی لکھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ ان میں مولوی چراغ حسن حسرت کے رسالہ "آفتاب" کے مضامین اس لیے اہم ہیں کہ انھیں خیال نے حسرت کے بار بار اصرار پہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس میں ہی شائع خیال کے انشائیہ "ہمارے پانچ ملک الشعرا" کی اگلوں کے یہاں دبی زبانوں میں تعریفیں بھی ملتی ہیں۔ "آفتاب" کا کوئی بھی شمارہ ہندوستان میں نہ مل سکا۔ کراچی کے جناب راشد اشرف کی مرتب کردہ کتاب "چراغ حسن حسرت: ہم تم کو نہیں بھولے" میں لاہور کے اب دوست ناصر حماد کا ایک مضمون بعنوان "آفتاب کے چار شمارے: ایک جائزہ" (۱۶) شامل اشاعت ہے جس میں انھوں نے "آفتاب" کے شمارہ بابت اپریل۔ مئی، جون، جولائی اور اگست ۱۹۶۲ء کی تفصیلات رقم کی ہیں۔

چراغ حسن حسرت کلکتے میں صحافت سے وابستہ تھے۔ وہ کئی اخبار اور رسائل سے بطور کالم نویس اور مدیر وابستہ رہے۔ اپنا رسالہ "آفتاب" بھی شائع کیا۔ مولانا ظفر علی خان کے اخبار "زمیندار" اور مولانا ابوالکلام کے "الہلال" اور "پیغام" کے علاوہ "عصر جدید"، "استقلال"، "جمہور"، "انصاف" اور "احسان" جیسے پرچوں کے لیے بھی کالم نویسی کی۔ کلکتے میں قیام کے دوران میں ان کی صحبتیں موید الاسلام جلال الدین کاشانی (مالک و مدیر "حبل المتین") اور خیال کے ساتھ بھی رہا کرتی تھیں۔ اپنی شگفتہ ادبی نثر کے ساتھ ہی وہ بطور شاعر بھی معروف تھے۔ کلکتے کا پہلا سفر حسرت نے ۱۹۲۱ء میں کیا تھا۔ اس سفر کے دوران ہی انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے "پیغام" میں ملازمت کی تھی۔ یہ ہفتہ وار ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جاری ہوا اور ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو اس کا آخری شمارہ منظر عام پر آیا۔ مولانا آزاد کی گرفتاری کی وجہ سے انھوں نے کلکتہ کو خیرباد کہہ دیا لیکن پھر ۱۹۲۵ء میں انھوں نے وہاں کا دوبارہ رخ کیا۔ اس مرتبہ انھوں نے کلکتہ کے نواب بدرالدین اسٹریٹ میں ایک مکان میں اقامت حاصل کی۔ اس علاقہ سے قریب ہی زکریا اسٹریٹ کا مشہور رنگون ریستوراں تھا جہاں دن بھر اردو اور فارسی کے ادیبوں اور شاعروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ حسرت نے "مردم دیدہ" میں چند شخصیات کے خاکے قلمبند کیے ہیں جن میں نصیر حسین خان خیال بھی شامل ہیں۔ خیال کی زندگی، ان کے کارناموں سے واقفیت اور ان کے عہد کے عظیم آباد اور کلکتہ کے علمی، ادبی، معاشرتی حالات سے واقفیت کے لیے ان کی خودنوشت "تزک خیال" بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی حیثیت عظیم آباد اور کلکتہ کے ایک معاشرتی کرونیکل کی بھی ہے۔ اس کی اشاعت ڈھاکہ سے خواجہ محمد عادل کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ "جادو" کے جنوری۔ فروری، مارچ، اپریل اور مئی ۱۹۲۶ء کے شماروں میں ہوئی تھی۔ خیال کے سلسلے میں جو بنیادی معلومات ادھر ادھر بکھری ملتی ہیں ان سب کی بنیاد یہی خودنوشت ہے۔ شائق احمد عثمانی اور اقبال سلیم نے بالترتیب "مغل اور اردو" اور "داستان اردو" میں اسی کی روشنی میں خیال کا زندگی نامہ ترتیب دیا ہے۔ ان دونوں حضرات کی پیش کردہ معلومات ہی بعد میں اوروں کے ذریعہ دہرائی گئی ہیں، مثلاً قدوس صہبائی، سالک لکھنوی، پروفیسر اعجاز حسین یا عبدالخالق وغیرہ نے جو تفصیلیں پیش کی ہیں وہ تمام کی تمام "مغل اور اردو" میں شائق عثمانی کے دیباچہ سے ماخوذ ہیں۔ وہیں عطاء الرحمن عطا کاکوی (۱۷)، نقی احمد ارشاد (۱۸)، سید مظفر حسین شمیم (۱۹) اور کلیم سہسرامی (۲۰) نے خودنوشت کے ان مطبوعہ حصوں کو ہی دوبارہ شائع کیا تھا۔ خیال کے سلسلے میں اب تک لکھے گئے مضامین میں حسرت کے اس خاکے کا ذکر نہیں ملتا ہے، جبکہ خیال کو سمجھنے کے لیے ان کے معاصرین میں سے کسی نے بھی اس سے بہتر تحریر قلمبند نہیں کی۔ خیال کی شخصیت کی مختلف جہات کو نمایاں کرنے والی اس تحریر میں ایسے کئی بیانات موجود ہیں جن کی توثیق دوسرے مصادر سے بھی ہوتی ہے۔

خیال حسینی الحسنی سید تھے۔ ان کے گھر کا ماحول مذہبی اور عقائد و رسوم کا پابند بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا گھر عظیم آباد میں ادب و تہذیب کا مدرسہ سمجھا جاتا تھا۔ اس میں مولویت کا شائبہ تک نہ تھا، اس کے باوجود مذہب اور اس کے ارکان و مراسم پہ سختی سے کاربند تھا۔ فرماتے ہیں کہ:

> "محرم کے مراسم و مجالس میں، اپنے گھر میں، بہت کم افراط و تفریط میں نے دیکھی۔ ہاں، اخیر زمانہ میں عشرہ کی ایک تاریخ میں زنجیر کا ماتم ہونے لگا تھا۔ مگر ہمارے بزرگ اس بدعت سے خوش نہ تھے۔ ہمارے یہاں کی مجلسوں میں مسلمانوں کا ہر فرقہ بہ شوق شریک ہوتا اور کسی کو بھی کسی اعتراض کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔" (۲۱)

شائق احمد عثمانی لکھتے ہیں کہ نواب ادیب الملک کے خاندان کا مذہب ہمیشہ شیعہ رہا ہے لیکن ان کی شیعیت وہ شیعیت ہے جس میں ولائے اہل بیت کے ساتھ خواہ مخواہ کسی ذات سے ابر او تکرار کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ وہ صحبتوں میں یہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو مسلک ان کا ہے وہی مسلک ان کے خاندان کا ہمیشہ سے رہا اور اسلام کے موجودہ اختلافات سے ان کا خانوادہ ہمیشہ دور و نفور رہا ہے۔ (۲۲) ان کے مذہبی میلان کے سلسلے میں چراغ حسن حسرت کا بھی بیان ہے کہ وہ عقیدہ کے لحاظ سے شیعہ تھے لیکن غلو ان کی طبیعت میں نام کو نہ تھا۔ نہ کبھی محرم کی جالس میں شریک ہوتے اور نہ ہی تعزیہ داری میں شرکت کرتے، اور کہا کرتے تھے کہ "ان چیزوں سے کیا حاصل؟ تعزیہ داری اصل میں پروپیگنڈے کا ایک طریقہ تھا۔ جن لوگوں کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا گیا تھا جب وہ نہ رہے تو تعزیہ داری کیا ضرورت باقی رہ گئی؟" (۲۳)

کلکتے میں حسرت اور خیال کے قیام کے دوران میں مسلم انسٹی ٹیوٹ، زکریا اسٹریٹ کا رنگون ریستوراں، خیال کی بنیا پوکھر اور گارڈن ریچ کی کوٹھیاں اور تالتلہ کے پاس شاد عظیم آبادی کا دولت خانہ ایسے مراکز تھے جہاں فارسی اور اردو شعر و ادب کے اکابر و اساطین کی مجلسیں سجتی تھیں۔ موید الاسلام جلال الدین کاشانی، مظفر الحسن شمیم، سلیم اللہ فہمی، مولوی چراغ حسن حسرت، پروفیسر عبد الرحیم، پروفیسر محفوظ الحق، نجیب اشرف ندوی، مولانا جلال الدین تہرانی، بہادر رضا علی وحشت کلکتوی، مولانا شائق احمد عثمانی، نواب زادہ ایف ایم عبد العلی، باقی غازی پوری، آغا حشر کاشمیری، علامہ جمیل مظہری وغیرہ ان صحبتوں میں شامل رہنے والے نامور حضرات تھے۔ چراغ حسن حسرت کا بیان ہے کہ:

> "وہ (خیال) شہر سے باہر تالتلہ کے پاس رہتے تھے۔ میں تقریباً ہر شام کو کام سے فارغ ہو کر ان کے ہاں پہنچ جاتا تھا۔ رات کے بارہ بجے تک صحبتیں رہتی تھیں اور اتوار کو سارا دن انہیں کے ہاں گزرتا تھا۔ انہیں صحبتوں میں کبھی مولانا شائق احمد عثمانی ہوتے تھے کبھی نواب زادہ ایف ایم عبد العلی باقی غازی پوری۔ خان بہادر رضا علی وحشت پروفیسر محفوظ الحق اور پروفیسر عبد الرحیم تشریف لے آتے تھے۔" (۲۴)

خیال سے اپنی آشنائی کے ذکر کے دوران میں حسرت لکھتے ہیں کہ پنجاب فائن آرٹ پریس والے برج لال بابو کو رسالہ نکالنے کا شوق تھا، اور مجھے ایڈیٹر بننے کا۔ آخر ہم دونوں کے اشتراک سے ۲۵ء کے اواخر میں رسالہ آفتاب نکلا۔ حسرت نے خیال کی کئی تحریریں شائع کی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ:

> "ایک دن میں ان سے ملنے گیا۔ بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے میں نے پوچھا "کوئی نئی کتاب شروع کی ہے؟" کہنے لگے بھئی، کہاں کی کتاب۔ امیر نواب (صاحبزادے کا نام) کو اردو پڑھانا چاہتا ہوں۔ کوئی ڈھب کی کتاب نہیں ملتی۔ اس کے لیے ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے"۔ کوئی سوڈیڑھ سو صفحات کی کتاب تھی۔ ہند اور اہل ہند اس کا نام رکھا تھا۔۔۔ اس کے چند اجزا میں نے "آفتاب" میں بھی چھاپے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے چھوٹے بڑے بیسیوں مضامین لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان میں ایک دلچسپ مضمون "ہمارے پانچ ملک الشعرا" "آفتاب" میں چھپا تھا۔ یہ ملک الشعرا کون تھے؟ سر عبد الرحیم، سر علی امام، عبد اللہ یوسف علی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین۔ لطف یہ کہ ان پانچوں میں ایک

بھی ایسا نہیں جسے شاعری سے کوئی تعلق ہو۔ طنزیہ مضمون تھا لیکن طنز کے پردے میں وہ بہت سی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔"(۲۵)

حسرت نے ۱۹۲۵ء کے اواخر میں اس رسالے کا اجرا کیا تھا۔ پہلے شمارے کے سارے مضامین خود انھوں نے لکھے تھے لیکن رفتہ رفتہ قلمی معاونین کی تعداد بڑھتی گئی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب خیال اس رسالہ کے لیے مضامین لکھنے کی خاطر آمادہ ہو گئے تو کوئی بھی شمارہ ان کے مضمون سے خالی نہیں رہتا۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ خیال کے کئی مضامین زینت آفتاب بنے تھے۔ رسالہ "آفتاب" میں مضمون "فردوسی و انیس" اور "ہمارے پانچ ملک الشعرا" کی اشاعت خیال کے فرضی نام ارژنگ سے ہوئی تھی۔ مکمل نام یوں لکھا ہے: مانیٔ فطرت حضرت ارژنگ۔ اسی نام سے گیا کے رسالہ "ندیم" میں مضمون "ہماری زبان" کی اشاعت بھی ہوئی تھی۔(۲۶) "آفتاب" کے ایک شمارے میں شامل خیال کے مضمون کے سلسلے میں گجرات کے ماہنامہ "زبان" میں درج ذیل بیان موجود ہے جس میں حسرت اور خیال دونوں کی ہی تعریف کی گئی ہے:

"یہ مشرقی ہندوستان کا مصور رسالہ بہ زیر ادارت جناب چراغ حسن حسرت صاحب کلکتہ سے جنوری ۲۶ء سے بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلنا شروع ہوا ہے۔ زیر نظر ستمبر نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندوستان کے بہترین لکھنے والے بہم پہنچائے ہیں اور مضامین کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے۔ چنانچہ نواب سید نصیر حسین صاحب خیال مدظلہ نے "ہندو اہل ہند" میں ہماری غذا کے متعلق واقعی اور نتیجہ خیال ظاہر فرمایا ہے۔"(۲۷)

اس اقتباس میں جس مضمون کا ذکر کیا گیا ہے وہ اسی کتاب کا حصہ ہے جسے خیال صاحبزادے کو اردو سکھانے کی غرض سے لکھ رہے تھے۔ "ہند اور اہل ہند" کے کچھ اجزا نقی احمد ارشاد نے بھی اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں(۲۸) اور لکھا ہے کہ یہ غیر مطبوعہ ہے۔ ستمبر کا شمارہ میں نے نہیں دیکھا، لیکن اسی موضوع سے متعلق خیال کی تحریر "آفتاب" کے جولائی ۱۹۲۶ء کے شمارے میں بعنوان "ہندی، ہمارا لباس" شائع ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ ستمبر والے شمارے میں اس کے دوسری قسط منظر عام پر آئی ہو۔ مضمون "ہندی، ہمارا لباس" کے سلسلے میں حسرت کے الفاظ ہیں کہ:

"ہماری التجا پر آپ نے کسی قدر ترمیم کے بعد یہ دو حصے آفتاب میں اشاعت کے لیے مرحمت فرمائے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قومیت سیاسیات کے سمندر کی سب سے اونچی لہر ہے لیکن ہندوستان میں گوناگوں معاشرتی اختلافات کی موجودگی میں ہماری نام نہاد قومیت کا وجود ہی کیا رہ جاتا ہے۔ جناب نواب صاحب مدظلہ نے اس اہم مسئلہ پر جس بالغ نظری سے روشنی ڈالی ہے یہ انہیں کا حصہ ہے۔ اسلوب بیان کی خوبی نے اس خشک موضوع کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔"(۲۹)

مضمون کے ان دونوں حصوں میں خیال نے ہندوستان کی معاشرت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مرکزی فکر تہذیبی بوقلمونی اور مسلمانوں اور ہندوؤں کا تہذیبی اختلاط ہے۔

حسرت نے خیال کا ایک اہم مضمون بعنوان "فردوسی و انیس" شائع کیا تھا جس میں مصنف نے فردوسی کے رزمیہ مناظر، خصوصاً رستم و اشکبوس کی جنگ کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا تقابل میر انیس کی رزم نگاری سے کیا ہے۔ اس موازنے کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فردوسی کے

مقابلے میں انیس کے رزمیہ بیانات میدانِ جنگ کے اصول وضوابط سے زیادہ ہم آہنگ اور قریب تر محسوس ہوتے ہیں۔ فردوسی کے اشعار اور انیس کے بندوں سے ماخوذ مثالوں کی روشنی میں مصنف نے اس تصور کو نہایت دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ اس پہلو سے میر انیس کو فردوسی پر سبقت حاصل ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "میر انیس کی شاعری کا زمانہ نصیر الدین حیدر (بادشاہ) کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت شاہنامہ و حملۂ حیدری، یہ دو مثنویاں ہماری شمع محفل بنی ہوئی تھیں۔ انیس کی طبیعت پر بھی ان کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ فردوسی کو اولیت و افضلیت حاصل ہے، اس لئے اپنے مراثی میں رزم کے موقعوں پر وہ زیادہ تر شاہنامہ کا وہ جواب دیتے ہیں جو فارسی شعر اسے بھی نہ بن پڑا۔ مگر میر انیس اسے ظاہر نہیں کرتے۔ یعنی فردوسی کو ٹوک کر کہیں اپنا مدمقابل نہیں بتاتے بلکہ اسے اپنے چھوٹے بھائی اور شاگرد میر مونس کے لیے چھوڑ دیتے [ہیں]۔" (۳۰)

خیال کے انتقال کے بعد "معاصر"، پٹنہ، میں سید علی سجاد پر ان کی ایک تحریر بعنوان "بہار کا ایک اردو ناول نگار" شائع ہوئی تھی۔ یہ تحریر سید علی سجاد کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی ادبی خدمات کا ایک مجموعی جائزہ ہے جسے خیال نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں پیش کیا ہے۔ یہ خیال کی انشاپردازی کی ایک انوکھی جہت کو روشن کرنے کے ساتھ ہی نثر نگاری سے ان کی دلچسپی اور اس کی افادیت پسندی کے تئیں ان کے طبعی میلان کو مزید واضح کرتی ہے۔ سید علی سجاد اور خیال دوست بھی تھے، رفیق کار بھی۔ ان دونوں نے مل کر عظیم آباد میں رسالہ "ادیب" کا اجرا کیا تھا۔ خیال کو یہ احساس تھا کہ علی سجاد کی ادبی خدمات جس مرتبہ کی ہیں ان کے مطابق ان پہ توجہ نہیں دی گئی۔ "معاصر" میں مضمون کی ابتدا میں اختر اورینوی کا نوٹ شامل ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ادارہ خیال عظیم آبادی کا ایک نادر غیر مطبوعہ مقالہ سید علی سجاد عظیم آبادی کے متعلق شائع کر رہا ہے۔ (۳۱) جبکہ خیال کا یہ مضمون "آفتاب" میں شائع ہو چکا تھا۔ حسرت لکھتے ہیں کہ:

> "ایک اور طویل مضمون جو انہیں دنوں آفتاب میں چھپا خیال کے ہم مکتب اور بچپن کے رفیق سید علی عرف پیارے صاحب کا تذکرہ ہے۔ جس میں ان کا قلم کہیں گلفشاں اور کہیں خونبابہ بار نظر آتا ہے۔ یعنی اس میں کہیں چوچلے اور چہلیں ہیں کہیں زمانہ کی قدرناشناسی کا ماتم۔" (۳۲)

اس سے ظاہر ہے کہ اختر اورینوی نے "آفتاب" کے شمارے نہیں دیکھے تھے۔ مضمون کا ابتدائی حصہ ملاحظہ کیجیے:

> "زمانہ مردہ پرست ہے، ایک عام اور مشہور مقولہ ہے۔ لیکن میرا وطن ایسے زبان زد فقرے سے بھی شاید آشنا نہیں۔ صوبۂ بہار کی خاک نے جو پتلے کھڑے کیے وہ اپنے رنگ و روپ میں کہیں کی زمین سے پست نہیں رہے، مگر اوروں نے اپنے کو سراہا اور اونچا کر دکھایا۔ اور ہم نے اپنے کاگوں کو ہمیشہ زمین میں ہی سلایا، اور خاک میں ہی ملایا۔ ان کی زندگیاں موت سے اور پھر موت زندگیوں سے کسی وقت بہتر نہیں نکلی۔ یہ سنت عرصہ سے جاری ہے اور آج بھی فرض و واجب کا حکم رکھتی ہے۔ سجاد بھی اسی تغافل شعار زمین سے اٹھے تھے اس لیے گمان کیسا، یقین کامل تھا کہ اِن کے ساتھ بھی اگلوں کا سا سلوک

کیا جائے گا۔ اور اگر کبھی زمانہ نے اس زمانہ شناس کو یاد کیا تو پھر اس وقت کوئی پورا نام ونشان بتانے والا باقی نہ رہے گا۔ اسی خیال سے یہ چند سطریں لکھوا دیں اور یہ بھی سمجھا کہ اپنوں کی یاد تازہ کر دینے کے لیے شاید یہی ایک بہانہ ہو جائے۔ اور اس ایک شمع کے جلتے باقی شکستہ مزاروں پر بھی کنول روشن دکھائی دینے لگیں۔"(۳۳)

علامہ شبلی نعمانی نے موازنہ میں میر انیس کے مراثی سے مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انیس نے کہیں کہیں سوقیانہ زبان استعمال کی ہے۔ خیال کو شبلی کا یہ بیان بہت ناگوار گزرا، انھوں نے ایک مضمون لکھ دیا۔ "تزک خیال" کے علاوہ سوانح کا ایک جز، جس کا تعلق حکیم سید قاسم علی لکھنوی سے ہے، رسالہ "خیابان" میں شائع ہوا تھا۔ اس کا تعلق اسی ناگواری سے ہے۔ حکیم صاحب کلکتے کے نامور طبیب تھے جنھیں انتقال کیے ہوئے کوئی بیس پچیس سال ہو چکے تھے۔ خیال نے حکیم صاحب کے عادات وخیالات اور ان کی خاص خاص صحبتوں کے نقشے کھینچے ہیں۔ ان میں ایک خاص صحبت کی کیفیت یہ ہے کہ حکیم صاحب حلقۂ احباب میں بیٹھے ہیں اور مولانا شبلی کی کتاب موازنہ انیس ودبیر پر گفتگو ہو رہی ہے:

"موازنہ... اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا... مولوی صاحب نے جس عقیدت وارادت سے یہ موازنہ ترتیب دے کر اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیا، اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ ان مرحوم کا خاص فن نہ تھا۔ اس صنف [مرثیہ] میں وسعت نظر نہ ہونے کی وجہ سے بعض جگہ کچھ لغزش بھی ہو گئی ہے۔ میر انیس کا مصرع ہے، سنتے ہی اس خبر کے خوشی ہو گئی شیریں۔ جناب مرحوم کا خیال تھا کا اس مقام پر خوشی کی جگہ خوش ہونا چاہیے، اور اسے انھوں نے لغزش اور زبان انیس کی کمزوری پر محمول کیا ہے۔ اس صحبت میں اس مصرع کا ذکر بھی آیا۔ حکیم صاب نے فرمایا کہ حال کے فصحا کا علم نہیں مگر ہماری زبان پر تو خوشی بھی ہے۔"(۳۴)

اس مضمون کی روشنی میں حسرت فرماتے ہیں کہ خیال کو اظہار خیال کے نئے نئے ڈھنگ معلوم تھے:

"وہ ادائے مطالب کے لیے ہمیشہ کوئی ایسی نئی راہ تلاش کر لیتے تھے کہ ان کی ذہانت اور سوجھ بوجھ پر حیرت ہوتی تھی"۔(۳۵)

انھوں نے یہ مضمون پڑھ کر خیال سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے حکیم سید قاسم علی بڑے صاحب علم بزرگ تھے۔ کہنے لگے کہ ہاں! ان کے صاحب علم ہونے میں کیا شک ہے؟ لیکن ان کی اس ہاں سے میری تسلی نہ ہوئی۔ پھر کہا کہ مرحوم نے اساتذہ کے ہزاروں شعر یاد کر رکھے ہوں گے جہاں کسی نے ٹوکا سند میں فوراً شعر پڑھ دیا۔ یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے:

"معلوم ہوتا ہے کہ تم بات کو پا گئے۔ خیر تم سے کیا پردہ؟ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا سارا خاندان انیس کا معتقد ہے اور میں اس عقیدت مندی میں سب سے آگے رہا ہوں۔ 'موازنہ انیس و دبیر' شائع ہوئی تو اس میں انیس پر اعتراضات دیکھ کر طبیعت بہت بے چین ہوئی۔ کئی مرتبہ سوچا کہ ان اعتراضات کا جواب ضرور ہونا چاہیے لیکن شبلی مرحوم میرے بزرگ اور

بزرگوں کے ملنے والے تھے اس لیے خون کے گھونٹ پی کے خاموش ہو رہا۔ آخر یہ خلش پچھلے دنوں دور ہوئی یعنی حکم سید قاسم علی کے حالات لکھنے بیٹھا تو خیال آیا کہ شبلی کے اعتراضات کا جواب ان سے کیوں نہ دلوایا جائے۔ حکیم صاحب شبلی مرحوم کے ہم سن اور عزت اور رتبہ میں ان کے برابر تھے۔ میں نے ان کی زبانی شبلی مرحوم کے متعلق جو باتیں کہلوائی ان میں سوئے ادب کا پہلو کہیں نہیں نکلتا۔ حالانکہ یہی باتیں اگر میں کہتا تو انگلیاں اٹھتیں۔ سب کہتے کہ کل کا لڑکا مولانا شبلی کی برابری کرنے چلا ہے۔"(۳۶)

''ہمارے پانچ ملک الشعرا'' کی اشاعت جون، جولائی اور اگست کے شماروں میں ہوئی تھی۔ اس میں خیال نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان، سر عبدالرحیم، سر علی امام، عبداللہ یوسف علی اور سر ضیاء الدین احمد کے خاکے پیش کیے ہیں۔ اس کا ذکر اوراق پارینہ میں دو تین دیگر اصحاب کے یہاں بھی ملتا ہے۔ سبھوں نے اسے خیال کے مشہور زمانہ انشائیہ ہونے کا اقرار تو کیا ہے لیکن قدوس صہبائی کے علاوہ کسی نے بھی کوئی عبارت پیش نہیں کی ہے۔ قدوس صہبائی نے لکھا تھا کہ:

"نواب خیال خود شاعر نہیں تھے لیکن سخن فہمی اور سخن سنجی میں غضب کا ملکہ رکھتے تھے۔ ان کے مضمون 'پانچ ملک الشعرا' میں نکتہ سنجی اور شاعری میں تخئیل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ نو مشق شعرا کے بارے میں لکھتے ہوئے انھوں نے عجیب صداقت پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: 'ان حضرات کی مثال تازی گھوڑے کی سی ہے رضالت موجود لیکن اچھے شہ سوار کی ران باگ دیکھی نہیں قدم تو چلے مگر جب پھریری لی، طبیعت سے مجبور ہو کر دولتی جھاڑ دی۔"(۳۷)

سبھی اصحاب کو ملک الشعرا کا خطاب دیتے ہوئے طنز و مزاح کا بہترین نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ان اصحاب سے خیال کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ اس مضمون کا تعارف کراتے ہوئے حسرت نے پانچویں پشت (۳۸) والی تحریروں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ خیال نے:

"اپنی اردو دانی اور خصوصاً مرثیہ خوانی کا بھی ثبوت دے کر واقف کاروں سے سند حاصل کر کے اپنی ہمہ دانی کا محضر تیار کر لیا۔ اب یہ ہیں وہ ''ڈسکوریاں'' اور یہ ہیں وہ خانہ تلاشیاں جن پر دنیا تصدق اور عالم نثار رہا! اسی طرح اگر ہمارے ایک مخدوم نے ہندوستان کے پانچ ایسے ملک الشعرا کو دریافت کر لیا جو اب تک روپوش تھے تو انھوں نے دنیا پر احسان اور عالم پر کرم فرمایا۔ اور اس محنت و تحقیق کے صلہ میں وہ جناب بھی مسلم یونیورسٹی کے ارکان اور خصوصاً وہاں کے فیاض اردو لیکچرر کی جانب سے اگر علامۂ عصر اور محقق وقت کا لقب قبول کریں تو اس دارالعلوم پر احسان فرمائیں۔"(۳۹)

اسی طرح خیال کے مضمون ''میر ضاحک'' سے قبل حسرت نے ایک طویل ادارتی نوٹ لکھا تھا۔ چند اجزا ملاحظہ کیجیے:

"یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خدائے سخن میر انیس سے زمین سخن آسمان بنی اور ہماری شاعری جو صرف گل و بلبل تک محدود اور مغرب کی آنکھوں میں خار تھی، شیکسپیر اور ہومر کو جواب دینے لگی۔ ارتقا فطرت کا مسلمہ قانون ہے۔ زبان

وبیان کا کمال تدریجی ترقی اور مختلف مدارج طے کرنے کے بعد انیس کے ورثہ میں آیا۔ یوں سمجھ لیجیے ضاحک نے زمین تجویز کی، حسن نے تخم ریزی کی، خلیق نے آبیاری کی اور انیس نے ایسے ایسے گلہاے معانی کھلائے جن کی دلآویز خوشبو سے دنیا مہک اٹھی۔ لکھنؤ اس وقت لفظی طوطا مینا بنانے کے گورکھ دھندے میں پھنسا ہوا تھا۔ لیکن اس فضا میں بھی رہ کر انیس کا دامن اس قسم کی بد مذاقی سے پاک رہا۔ بلکہ بہت سے بھولے بھٹکے اسی دامن کے طفیل راہ راست پر آ گئے۔

یہ مضمون اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، ہم آمد بالا قساط اس سلسلہ میں اور مضامین ہدیہ ناظرین کریں گے۔ اس موقع پر اتنا ملحوظ خاطر رہے کہ ضاحک، حسن، خلیق کا کلام سمجھے بغیر انیس کے کمال فن کا سمجھنا ان کے صحیح مرتبہ کا اندازہ اور ان کے معاصرین سے موازنہ ناممکن ہے۔ مخدومی نواب سید نصیر حسین صاحب خیال بالقابہ دورِ حاضرہ کے بے نظیر انشا پرداز، بلند پایہ محقق، ایک روش خاص کے موجد، اور طرز میں مقلد نہیں بلکہ مجتہد ہیں۔ آپ کے انداز تحریر کے متعلق عرض کرنا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ ''آفتاب'' کو آپ کی ذات گرامی سے بہت کچھ توقعات ہیں اور امید ہے دنیاے علم کا یہ ناچیز ذرہ نظر انور سے فروغ پاتا اور اپنے صحیح معنوں میں آفتاب کہلاتا رہے گا۔"(۴۰)

خیال کی زباندانی کے ذکر کے دوران میں حسرت فرماتے ہیں کہ:

"زبان کے معاملہ میں وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے بلکہ کہیں کہیں عام اصول و قواعد سے انحراف بھی کر جاتے تھے۔ ''داستان اردو'' کا مسودہ پہلی مرتبہ میری نظر سے گزرا تو اس میں کئی ایسی ترکیبیں نظر آئیں جو قاعدہ کی رو سے غلط تھیں۔ مثلاً بعض جگہ انھوں نے فارسی اور بھاشا کے الفاظ کو آپس میں ترکیب دے کر کوئی اصطلاح گھڑ لی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا، ''نواب صاحب فارسی اور بھاشا کے الفاظ میں عطف و اضافت قاعدہ کے رو سے غلط ہے''۔ کہنے لگے، ''اتنا تو میں بھی جانتا ہوں لیکن تم نے دیکھا نہیں میں نے بھاشا کے جن الفاظ کو فارسی سے ترکیب دیا ہے وہ باعتبار صوت فارسی سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک ایسے الفاظ کو باہم دگر ترکیب دینے میں کوئی ہرج نہیں''۔"(۴۱)

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ حسرت کی نگاہوں میں خیال کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ خیال کے اسلوب نگارش کے سلسلے میں ان کا تصور یہ ہے کہ:

"خیال کبھی کوئی پرانا قصہ بیان کرتے تھے تو سماں باندھتے تھے اور لکھنے بیٹھتے تھے تو موتی رولتے چلے جاتے تھے۔ نثر میں ان کا انداز محمد حسین آزاد سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن آزاد اپنی تحریروں کو بہت کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے۔ انھوں نے جہاں کوئی چیز قلم برداشتہ لکھی ہے اس میں ان کے حقیقی انداز کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ ان کے خطوں کا مجموعہ 'مکتوبات آزاد' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ دو تین خطوں کے سوا باقی سب پھیکے ہیں۔ خیال کا یہ حال نہیں تھا۔ وہ قلم برداشتہ بھی لکھتے تھے تو ماہر فن مرصع نگار کی طرح الفاظ کے نگینے جڑتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دوستوں کو وقتاً فوقتاً جو

خط لکھے ہیں ان میں بھی عجب کیفیت ہے۔ کئی مضمون انھوں نے مجھے لکھوا دیے اور نظر ثانی کیے بغیر چھپنے بھیج دیے۔" (۴۲)

طیب منیر نے "آفتاب" کے جن ہنگامہ خیز مضامین کا ذکر کیا ہے ان میں "ہمارے پانچ ملک الشعرا"، "فردوسی و انیس"، اور "داستان اردو" بھی شامل ہیں۔(۴۳) "داستان اردو" کو حسرت نے خیال کی اہم ترین تصنیف قرار دیا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا کون سا حصہ "آفتاب" کے کس شمارے میں شائع ہوا تھا۔

چراغ حسن حسرت نے خیال کے ذوق شاعری کا ذکر بھی کیا ہے۔ جب مسلم لیگ کے فعال رکن اور بنگال مسلم پارٹی کے رہرواں سر عبدالرحیم نے اپنی سیاسی سازشوں کے تحت ۱۹۲۷ء میں کانگریس سے مل کر بنگال کی نو تشکیل شدہ وزارت کو منتشر کر دیا تو، بقول چراغ حسن حسرت:

"اس واقعہ پر اخباروں میں بڑے زناٹے کے مضامین نظم و نثر چھپے۔ ان میں ایک مزے کی نظم بھی تھی جو مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ ہمدرد نے شاعر کا نام نہیں بتایا تھا البتہ اس کے ابتدا میں ایک نوٹ لکھ کر واضح کر دیا تھا کہ یہ نظم کلکتہ کے ایک صاحب ذوق بزرگ کے قلم سے نکلی ہے۔ کوئی پچاس پچپن شعر کی نظم تھی لیکن سارے شعر ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ مجھے صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

غزنوی کون کہے تجھ سے دنی فطرت کو
نام محمود نما اور غلامی میں ایاز

یہ نظم پڑھ کے بہت حیرت ہوئی کہ کلکتہ میں کون ہے جو ایسے شعر لکھے۔ ہر پھر کے حضرت خیال پر ہی نظر پڑتی تھی لیکن اس معاملہ میں ان کا یہ حال تھا کہ شعر کا نام لیتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ دوسرے دن میں ان سے ملنے گیا تو ہمدرد کا پرچہ ان کی میز پر پڑا تھا۔ میں نے پرچہ اٹھا کے کہا "آپ نے یہ نظم ملاحظہ فرمائی۔" کہنے لگے "ہاں"۔ میں نے کہا، "کیا خیال ہے"؟ کہنے لگے "خاصی ہے" میں نے کہا "یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کلکتہ میں ایسی نظم لکھنے والا کون ہے؟" مسکرا کر کہنے لگے "بہتیرے اللہ کے بندے پڑے ہیں۔" میں نے کہا، "کہیں آپ تو نہیں"؟ یہ سن کر مسکرا پڑے اور پہلو بدل کے کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔ میں تو یہ سمجھ گیا کہ یہ نظم انھوں نے ہی لکھی ہے لیکن انھیں اخفا منظور تھا۔ اس لئے میں نے بھی زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔" (۴۴)

خیال کے زیادہ تر مضامین میں ثقافتی بو قلمونی کا ایسا آہنگ موجود ہے جو قاری کو دعوت غور و فکر بھی دیتا ہے اور ماضی کی مستحکم معاشرتی آمیزشوں کے فہم کا سلیقہ بھی عطا کرتا ہے۔ مذہبی امور میں اصلاح کی کوششوں سے شروع ہونے والا خیال کے مضامین، خطبات و مکتوبات کا سلسلہ اس اضطراب کی آئینہ سازی بھی کرتا ہے جسے وہ ایک دانشور کی حیثیت سے محسوس کرتے رہے۔ ان کی نگاہیں ثقافت و معاشرت کے جن پہلوؤں پہ ٹکی تھیں، اور وہ قلم و بیان سے جس دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے رہے اس سے ظاہر ہے کہ معاشرے کے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے مسلمانان ہند اور برادران وطن کو دائمی

اخوت و محبت کا پیغام دینا ہی ان کی نگاہ میں اردو اور مسلمانوں کے استحکام کے لیے واحد راہ عمل تھا۔ بہار کے ممتاز نثر نگاروں میں سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، سید امداد امام اثر، سید علی محمد شاد عظیم آبادی، عبد الغفور شہباز، نصیر حسین خیال، سید سلیمان ندوی اور حمید عظیم آبادی کے اسمائے گرامی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو نثر کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھنے والے ان اصحاب میں نصیر حسین خیال اپنی انشاپردازی اور فکری اسلوب کے اعتبار سے خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ خیال کو صرف "مغل اور اردو" کے حوالے سے جانا جاتا رہا، اور اس کا وہی حشر ہوا جو امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" کا ہوا تھا۔ یعنی، جس طرح عرصۂ دراز تک اثر کو حالی کے پس منظر میں پڑھا جاتا رہا، اسی طرح خیال کو محمد حسین آزاد کی "آب حیات" کی روشنی میں دیکھا جاتا رہا۔ لیکن خیال کے معاصرین میں اگر ہم صرف حسرت کے بیانات پر ہی اکتفا کریں تو اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تصنیف و تالیف کی خیال کی دنیا ہی الگ تھی، اور آزاد کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔

خیال کے زیادہ تر مطبوعہ مضامین ایسے ہیں جن سے قبل ان کی شخصیت اور متعلقہ مضمون کے موضوع پر ادارتی نوٹ بھی شامل ہیں۔ حسرت نے نہ صرف اس روایت کو قائم رکھا، انھوں نے خیال کو اس کا بھی بھرپور موقع فراہم کیا کہ وہ اپنی طبعی جولانی کے مطابق جن موضوعات کو مناسب سمجھیں، ان پر لکھیں۔ یہی سبب ہے کہ "آفتاب" کے بعض شماروں میں خیال کی بیک وقت دو تحریریں بھی انھوں نے شائع کیں، ایک خیال کے نام سے، دوسری ان کے فرضی نام، ارژنگ، سے۔ چونکہ اس زمانے میں بھی عام طور پر قارئین اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ یہ خیال کا فرضی نام ہے، اس لیے ان مضامین پر خیال کی تحریروں کے طور پر توجہ نہیں دی گئی۔ خیال کے تئیں اظہار عقیدت پیش کرتے ہوئے حسرت کہتے ہیں کہ:

> "افسوس کہ اردو نثر نگاری میں جتنا اونچا ان کا پایہ ہے، اتنی شہرت نہیں پائی۔ ان کے کارناموں سے آشنا ہونا تو در کنار، اکثر پڑھے لکھے لوگ ان کا نام تک نہیں جانتے۔" (۴۵)

کلکتے میں خیال اور حسرت کے قیام کے دوران جمیل مظہری بھی بزرگوں سے اکتساب فیض کے لیے ان کی مجلسوں میں حاضر رہتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں خیال صرف انشاپرداز نہیں بلکہ بڑی حد تک ایک مفکر اور مورخ بھی تھے۔ "انھوں نے سب سے پہلے مجھے مذہب اور تصوف کا رستہ سمجھایا۔ تشیع اور تصوف کی علیحدگی کی داستان سنائی۔ اور اس سلسلے میں جو روشنی مجھے دی وہ آج بھی میرے دماغ میں محفوظ ہے"۔ (۴۶) انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کی ہی مانند آغا حشر کاشمیری اور نواب خیال نے ان کے ذہن کی تعمیر میں مساوی حصہ لیا تھا۔ وہیں، اس ادبی تعلق کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ، بالفاظ طیب منیر:

> "خیال عظیم آبادی کی صحبت نے حسرت کو سکھا دیا کہ تحریر میں سبک ترکیبیں ہوں، ہلکے پھلکے الفاظ ہوں، اور مغلق الفاظ و تراکیب سے بچا جائے"۔ (۴۷)

حوالہ جات و حواشی

۱۔ محفوظ الحق احسن۔ نواب نصیر حسین خان صاحب خیال، مشمولہ، العصر۔ لکھنؤ، فروری ۱۹۱۷ء۔ ص ۸۱-۸۴

۲۔ ارشد مسعود ہاشمی۔ سید نصیر حسین خاں خیال۔ نئی دہلی: اصیلا آفسٹ، ۲۰۲۳ء

۳۔ سید رضا قاسم، ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال عظیم آبادی، ندیم، جنوری ۱۹۳۸ء۔ ص ۲۱

۴۔ ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں خیال۔ مغل اور اردو، (شائق احمد عثمانی کا پیش لفظ)۔ کلکتہ: شائق احمد عثمانی اینڈ سنز پبلشر، ۱۹۳۳ء۔ ص ا

۵۔ سید بدرالدین احمد۔ حقیقت بھی کہانی بھی۔ پٹنہ: بہار اردو اکادمی، ۲۰۰۳ء۔ ص ۶۹

۶۔ ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں خیال۔ داستان اردو۔ حیدر آباد: ادارۂ اشاعت اردو، ۱۹۴۵ء۔ ص ۲

۷۔ نواب نصیر حسین خیال۔ تزک خیال، جادو۔ ڈھاکہ: جنوری فروری ۱۹۲۶ء۔ ص ا

۸۔ نقی احمد ارشاد۔ مقالات و مکتوبات نصیر حسین خیال۔ پٹنہ: بہار اردو اکادمی، ۱۹۸۱ء۔ ص ا۔ ۲

۹۔ نواب نصیر حسین خیال۔ تزک خیال، جادو۔ ص ۱۷

۱۰۔ سید فیضان رضا نے کراچی کے دو ایسے اصحاب سے ذاتی مراسلوں کے ذریعہ بعض معلومات فراہم کی ہیں جن سے سید امیر نواب کے دیرینہ تعلقات رہے ہیں۔ کراچی کے پروفیسر محمد رضا کاظمی نے Islam and Human Rights کے موضوع پر امیر نواب کے کتابچہ کی اشاعت کی توثیق کی ہے۔ ان کی اطلاع کے مطابق امیر نواب کا انتقال کراچی میں ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ پروفیسر محمود رضا کاظمی کے برادر خورد سید کاظمی اور امیر نواب رفیق کار بھی تھے۔ انھوں نے امیر نواب کی دو انگریزی تصانیف کا تذکرہ کیا ہے (Islam's Gift to Humanity: Human Rights (Huqooq-ul -Ibaad اور Two Asian Revolutions, Two New Democracies۔ اپنی کتاب Mr. Tourism میں کاظمی صاحب نے نواب کے ذکر کے دوران ایسی معلومات بہم پہنچائی ہیں جو اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان کے سلسلے میں سرحد کے اِس پار کسی کو کوئی واقفیت نہیں ہے۔ ہجرت سے قبل وہ کلکتہ میں منبیندر ناتھ رائے کی انقلابی جماعت کے سرگرم کارکن تھے۔ پاکستان جانے کے بعد نواب ۱۹۵۰ء کے دہے میں سیلانی کی حیثیت سے پاکستان مقبوضہ کشمیر کی وادیٔ نیلم اور دیگر شمالی علاقوں کی سیاحت کرتے رہے۔ اس دوران انھوں نے سیاحت نامے بھی لکھے جن کی اشاعت حکومت پاکستان کے رسالہ The Perspective میں ہوئی تھی۔ امیر نواب قد آور شخصیت کے حامل تھے اور شناساؤں کے حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کا سبب خاندانی وجاہت کے ساتھ ہی ان کی اپنی شخصیت بھی تھی۔ جسٹس دوراب پٹیل سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ نواب جب بھی ان کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ خود باہر آکر ان کا استقبال کیا کرتے تھے۔ امیر نواب سے سید کاظمی کی پہلی ملاقات کراچی کے Aage Kadam Printery میں اس کے مالک احمد علی کی صدارت میں منعقد آزاد خیالوں کے ایک اجلاس میں ہوئی تھی۔ اس قسم کی مجلسوں میں نواب پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور ان کی منفرد شناخت قائم ہو چکی تھی۔ ان کی دوسری ملاقات The Diplomat نام کے رسالہ کے دفتر میں ہوئی تھی۔ سید کاظمی اس رسالہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بنائے گئے تھے۔ نواب وہاں پہلے سے ہی آپریشنل ڈپٹی ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کاظمی صاحب چند واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نواب مرحوم سے انھوں نے ادارتی ذمہ داریوں کی کئی باریکیاں سیکھی تھیں۔ وہ صحافت کے بلند معیار کی علامت تھے۔ The Diplomat سے کاظمی صاحب کے الگ ہونے کے بعد بھی ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ امیر نواب نے کراچی سے شائع ہونے والے Pakistan Illustrated Weekly میں بھی ملازمت کی تھی۔

۱۱۔ بہزاد فاطمی۔ یہ فسانہ زلف دراز کا۔ پٹنہ: اندراج نہیں، س ن۔ ص ۴۲

۱۲۔ نواب سید نصیر حسین خاں خیال۔ مغل اور اردو۔ کلکتہ،: شائق احمد عثمانی اینڈ سنز پبلشر ز۔ ۱۹۳۳ء
۱۳۔ نصیر حسین خاں خیال۔ داستان اردو۔
۱۴۔ سید نصیر حسین خاں خیال۔ داستان عجم
۱۵۔ قدوس صہبائی۔ نواب نصیر حسین خیال،۔ نگار، مئی، ۱۹۵۵ء۔ ص ۳۸۔ ۴۱
۱۶۔ ناصر حماد۔ آفتاب کے چار شمارے: ایک جائزہ۔ راشد اشرف، (مرتب)، چراغ حسن حسرت: ہم تم کو نہیں بھولے. کراچی: بزم تخلیق ادب، ۲۰۰۳ء۔ ص ۴۶۴۔ ۴۶۸
۱۷۔ عطاء الرحمن عطا کاکوی۔ خیال عظیم آبادی کے خود نوشت حیات۔ مشام، جنوری ۱۹۸۱ء۔ ص ۸۷۔ ۱۰۸
۱۸۔ نقی احمد ارشاد۔ تزک خیال۔ خدا بخش لائبریری جرنل، ش ۱۳۱، جنوری-مارچ ۲۰۰۳ء۔ ص ۷۳۔ ۵۲
۱۹۔ سید مظفر حسین شمیم،۔ داستان اردو۔ ساقی مئی، ۱۹۳۴ء
ـــــ، مغل اور اردو کے بعض محاسن۔ نیرنگ خیال (لاہور)، اکتوبر، ۱۹۳۳ء۔ ص ۴۔ ۹
ـــــ، داستان اردو،۔ نیرنگ خیال۔ اکتوبر، ۱۹۳۳ء۔ ص ۴۔ ۹
۲۰۔ کلیم سہسرامی۔ روایت و درایت،۔ پٹنہ،: نقاد پبلشر ز، ۱۹۹۱ء
۲۱۔ سید نصیر حسین خان خیال۔ تزک خیال (اول)۔ ص ۱۲
۲۲۔ نواب سید نصیر حسین خاں خیال۔ مغل اور اردو۔ ص ۶
۲۳۔ چراغ حسن حسرت۔ مردم دیدہ۔ لاہور: دارالاشاعت، ۱۹۳۹ء۔ ص ۳۳
۲۴۔ ایضاً۔ ص ۳۰
۲۵۔ ایضاً۔ ص ۴۳۔ ۵۲
۲۶۔ حضرت ارژنگ۔ ہماری زبان، ندیم (گیا)، اگست، ۱۹۳۴ء۔ ص ۹۔ ۲۰
۲۷۔ عابد رضا بیدار (مرتب) گجرات کا ماہنامہ زبان۔ پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۸۷ء
۲۸۔ نقی احمد ارشاد۔ ۱۹۸۱ء
۲۹۔ سید نصیر حسین خاں خیال۔ "ہندی، ہمارالباس"۔ آفتاب (کلکتہ)، جولائی، ۱۹۲۶ء۔ ص ۳
۳۰۔ حضرت ارژنگ۔ فردوسی و انیس، آفتاب (کلکتہ)، اپریل۔ مئی، ۱۹۲۶ء۔ ص ۲۹
۳۱۔ نصیر حسین خیال عظیم آبادی۔ اردو ناول نگار۔ معاصر ۱۹۴۵ء۔ ص ۷
۳۲۔ حسرت۔ ایضاً، ص ۴۵
۳۳۔ نصیر حسین خیال عظیم آبادی، اردو ناول نگار۔ ص ۱۱
۳۴۔ نواب سید نصیر حسین خاں خیال۔ حکیم سید قاسم علی مرحوم لکھنوی۔ خیابان، جنوری، ۱۹۲۷ء۔ ص ۱۹۳۔ ۲۰۱

۳۵۔ حسرت۔ ایضاً۔ ص ۵۰

۳۶۔ ایضاً۔ ص ۵۲۔ ۵۳

۳۷۔ قدوس صہبائی،۔ نواب نصیر حسین خیال۔ نگار، مئی، ۱۹۵۵ء۔ ص ۳۸۔ ۴۱

۳۸۔ رسالہ "جادو"، ڈھاکہ میں "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں" کے عنوان سے نصیر حسین خیال اور مولانا حبیب الرحمن شروانی کے خطوط شائع ہوئے تھے ان کا تعلق انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع شدہ میر حسن اور میر تقی کے تذکروں سے تھا جس کے لیے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے مقدمہ تحریر کیا تھا۔ چراغ حسن حسرت کا بیان ہے کہ "جادو میں دیر تک دونوں طرف سے مضامین شائع ہوتے رہے۔ آخر نظم طباطبائی کو حکم مقرر کیا گیا، اور انھوں نے اپنے محاکمہ میں خیال کی تائید کر کے اس بحث کو ختم کر دیا"۔ (حسرت، ۴۴)

۳۹۔ مانیٔ فطرت حضرت ارژنگ، ہمارے پانچ ملک الشعرا (پہلی قسط)، آفتاب (کلکتہ)، جون، ۱۹۲۶ء۔ ۳۲۔ ۳۸

۴۰۔ ادیب فقید المثال سید نصیر حسین خیال۔ "میر ضاحک"۔ آفتاب (کلکتہ)، جون، ۱۹۲۶ء۔ ص ۳

۴۱۔ حسرت۔ ایضاً۔ ص ۴۷۔ ۴۸

۴۲۔ ایضاً۔ ص ۳۹۔ ۴۰

۴۳۔ طیب منیر۔ چراغ حسن حسرت: احوال و آثار۔ کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۳ء۔ ص ۲۶۲

۴۴۔ حسرت۔ ایضاً۔ ص ۳۵۔ ۳۷

۴۵۔ ایضاً۔ ص ۵۲

۴۶۔ اعجاز علی ارشد (مرتب)، منثورات جمیل مظہری۔ پٹنہ: بہار اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء۔ ص ۳۹۰

۴۷۔ طیب منیر۔ ایضاً۔ ص ۵۳